غلام عباس

(حالاتِ زندگی)

غلام عباس ۱۹۰۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ انٹر اور علومِ شرقیہ کے امتحانات لاہور سے پاس کیے۔ پندرہ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔ بچوں کے لیے بھی چند کتابیں لکھیں۔ پھر رسالہ ''پھول'' اور ''تہذیبِ نسواں'' میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوگئے۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوگئے اور ریڈیو پاکستان کے رسالے ''آہنگ'' کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

پریم چند کے بعد اُردو کے گِنے چُنے افسانہ نگاروں میں غلام عباس کا شمار ہوتا ہے۔ اُن کا افسانہ ''آنندی'' اُردو کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کا مواد اِس ماحول سے لیتے ہیں جس ماحول سے شب و روز اُن کو سروکار رہتا ہے۔ وہ موضوعات کے انتخاب میں ہر قسم کے تعصب سے بالاتر رہتے ہیں۔

اُن کے افسانوں کی زبان نہایت سادہ اور رواں ہے۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بڑی روانی کے ساتھ اُس بات کو ادا کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں تصنع اور بناوٹ نہیں پائی جاتی۔ اُن کا اسلوب مختصر نویسی کے اعتبار سے بھی ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بے جا تفصیلات سے گریز کرتے ہیں۔ صرف مقصد کی بات کہتے ہیں۔ اور باقی باتیں چھوڑ دیتے ہیں۔

غلام عباس کے افسانوں کی ایک نمایاں خوبی اُن کا طنزیہ انداز ہے۔ وہ معاشرے کے اُن پہلوؤں پر بھرپور وار کرتے ہیں؛ جن کو تہذیب و تمدّن کی کھوکھلی چمک دمک اور ظاہری رکھ رکھاؤ کی بنا پر متوسط طبقے کے لوگوں نے اپنے لیے سرمایہ حیات بنا رکھا ہے۔

اُن کا اسلوب حقیقت پسندانہ ہے۔ اُن کے ہاں رومانی عناصر نہیں ملتے۔ اُن کے نزدیک زندگی ہنسی، کھیل اور تمسخر کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے۔ اُن کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں ایک یا دو یا چند کرداروں کو نہیں بلکہ پورے شہر کو ایک مجسم کردار کی صورت میں رچتا بستا اور جیتا جاگتا دکھاتے ہیں۔ غلام عباس کے کردار ہماری زندگی کے جیتے جاگتے کردار ہوتے ہیں۔ اُن کے افسانے ندرتِ موضوع کی وجہ سے مقبولِ خاص و عام ہوئے ہیں۔ اُن کے بیش تر افسانوں کے موضوعات منفرد ہیں۔

آپ نے بہت کم افسانے لکھے؛ مگر ادبی اور فنی نقطہ نظر سے اُن کا ہر ایک افسانہ شاہکار ہے۔ اُن کے افسانے آنندی، جاڑے کی چاندنی، کن رس، الحمرا کے افسانے اور ناول دھنک، گوندنی والا تکیہ زیادہ مشہور ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں لاہور میں وفات پائی۔

کتبہ

(غلام عباس)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو صنف افسانہ کے خدوخال بتانا۔ ۲۔ اُردو ادب میں افسانے کے تدریجی ارتقا سے آگاہی دینا۔
۳۔ غلام عباس کے اسلوبِ تحریر سے واقفیت دلانا۔ ۴۔ طلبہ سے عبارت میں معاون فعل کی تلاش کرانا۔

خاص الفاظ و تراکیب: پھلواریوں ۔ چوڑی چکلی ۔ تلوے ۔ رکھوالی ۔ مادری زبان ۔ وضع قطع ۔ سنگ تراش ۔ رہنمائی کا جویا ۔ قبضہ جمانا

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پُر فضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہوئی، قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جو دُور دُور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواروں ہی میں محدود رہتی ہے۔ مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے۔ ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں سے آیا ہو اور اپنے ساتھ بہت سا خس و خاشاک بہا لایا ہو۔

گرمی کا زمانہ، سہ پہر کا وقت، درختوں کے سایے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے، مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جوتوں کے اندر تلوے جُھلسے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی۔ سڑک پر جہاں پانی پڑا تھا، بخارات اُٹھ رہے تھے۔

شریف حسین کلرک درجہ دوم معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اس بڑے پھاٹک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔ گھر کو لوٹتے ہوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لطف تھا جو مہینے کے شروع کے صرف پانچ روز ہی ملا کرتا تھا اور آج کا دن بھی اُن ہی مبارک دنوں میں سے ایک تھا۔ آج خلافِ معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد بھی اُس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اُس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ دن میں دفتر کے حلوائی سے دو چار پوریاں لے کر کھا لی تھیں اور اُوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا۔ رات کو شہر کے کسی سستے سے ہوٹل میں جانے کی ٹھہرائی تھی۔ بس بے فکری ہی بے فکری تھی، گھر میں کچھ اثاثہ تھا نہیں جس کی رکھوالی کرنی پڑتی اس لیے وہ آزاد تھا کہ جب چاہے گھر جائے اور چاہے تو ساری

رات سڑکوں ہی پر گھومتا رہے۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنی شروع ہوئیں۔ ان میں ٹائپسٹ، ریکارڈ کیپر، ڈسپیچر، اکاؤنٹنٹ، ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ، غرض ادنیٰ اعلیٰ ہر درجے اور حیثیت کے کلرک تھے اور اسی لحاظ سے ان کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی۔ مگر بعض ٹائپ خاص طور پر نمایاں تھے۔ سائیکل سوار آدھی آستینوں کی قمیص، خاکی زین کی نکر اور چپل پہنے، سر پر سولا ہیٹ رکھے، کلائی پر گھڑی باندھے، رنگ دار چشمہ لگائے، بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے منہ میں بیڑی، بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے۔ ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اِس اُمید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے، ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں اُن کا کوئی حل سوچا جائے۔ مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی کے کاموں میں ایسے الجھ جاتے کہ انہیں دیکھنے تک کا موقع نہ ملتا اور اگلے روز انہیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا۔

بعض من چلے، سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز ٹوپی ہاتھ میں۔ کوٹ کاندھے پر، گریبان کھلا ہوا جسے بٹن ٹوٹ جانے پر انہوں نے سیفٹی پن سے بند کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کے نیچے چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تربتر نظر آتے تھے۔ نئے رنگروٹ سستے سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے بدقطع سوٹ پہنے۔ اس گرمی میں واسکٹ اور نکٹائی کالر تک سے لیس، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فونٹین پن اور پنسلیں لگائے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔

گو اِن میں سے زیادہ تر کلرکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی مگر لب ولہجہ بگاڑ کر غیر زبان میں باتیں کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اس میں باتیں کرنے پر اُکساتی تھی بل کے یہ کہ انہیں دفتر میں دن بھر اپنے افسروں سے اسی غیر زبان میں بولنا پڑتا تھا اور اس وقت وہ باہم بات چیت کر کے اس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے۔

ان کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر بھولے بھالے نا تجربہ کار بھی جن کی ابھی مَسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں اور جنھیں ابھی سکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور عمر رسیدہ جہاں دیدہ گھاگ بھی جن کی ناک پر سالہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا اور جنھیں اس سڑک کے اُتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس تیس تیس برس ہو چکے تھے۔ بیش تر کارکنوں کی پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم سا آ گیا تھا اور کند اُستروں سے متواتر داڑھی مونڈتے رہنے کے باعث ان کے گالوں اور تھوڑی پر بالوں کی جڑیں پھوٹ نکلی تھیں جنھوں نے بے شمار ننھی ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

پیدل چلنے والوں میں بہتیرے لوگ بہ خوبی جانتے تھے کہ دفتر سے ان کے گھر کو جتنے راستے جاتے ہیں ان کا فاصلہ کے ہزار قدم ہے۔ ہر شخص افسروں کے چڑ چڑے پن یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں تھا۔

ایک تانگے کی سواری میں ایک کی کمی دیکھ کر شریف حسین لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ تانگہ چلا اور تھوڑی دیر میں شہر

کے دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ شریف حسین نے اکنی نکال کر کوچوان کو دی اور گھر کی بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا جس کی سیڑھیوں کے گرداگرد ہر روز شام کو کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سجا کرتی تھیں اور میلہ سا لگا کرتا تھا۔ دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے۔ اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو تو بھی یہاں اور لوگوں کی چیزیں خریدتے، مول تول کرتے دیکھنا بجائے خود ایک پُرلطف تماشا تھا۔ شریف حسین لیکچر باز حکیموں، سنیاسیوں، تعویذ گنڈے بیچنے والوں سیانوں اور کھڑے کھڑے تصویر اتار دینے والے فوٹو گرافروں کے جمگھٹوں کے پاس ایک ایک دو دو منٹ رکتا، سیر کرتا، اس طرف جا نکلا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں اسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں۔ ان میں بعض ایسی تھیں جو اپنی اصلی حالت میں بلاشبہ صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی، مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑتے پڑتے یا تو اُن کی صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی یا اُن کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا جس سے وہ بے کار ہو گئی تھیں۔ چینی کے ظروف اور گل دان، ٹیبل لیمپ، گھڑیاں، جلی ہوئی بیڑیاں، چوکھٹے، گراموفون کے کل پرزے، جراحی کے آلات، ستار، بھس بھرا ہرن، پیتل کے لم ڈھیک، بدھ کا نیم قد مجسمہ............

ایک دکان پر اس کی نظر سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو معلوم ہوتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اُکھاڑا گیا ہے۔ اس کا طول کوئی سوا فٹ تھا اور عرض ایک فٹ۔ شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اٹھا کر دیکھا۔ یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اس نے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا، قیمت دریافت کی۔

تین روپے! کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا۔

کیوں حضرت چل دیے؟ آپ بتائیے کیا دیجیے گا؟

وہ رُک گیا۔ اسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم سی آئی کہ اسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی اور اس نے محض اپنے شوقِ تحقیق کو پورا کرنے کے لیے قیمت پوچھی تھی۔ اس نے سوچا دام اس قدر کم بتاؤ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے جو دکاندار کا وقت ضائع اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے۔

''ہم تو ایک روپیہ دیں گے''۔ یہ کہہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جلد جلد قدم اُٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے مگر اس نے مہلت ہی نہ دی۔

''اجی سنیے تو۔ کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سوا روپیہ بھی نہیں............ اچھا لے جائیے''۔

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لوٹنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے اس مرمریں ٹکڑے کو اُٹھا کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے تو اس سودا منسوخ کر

دے۔ مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔ جانے کباڑی نے اسے اس قدر سستا بیچنا کیوں قبول کیا تھا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجب ہیں۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔ وہ کلرک درجہ دوم سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے یہ نہیں تم کم سے کم ہیڈ کلرک ہی سہی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اسے محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا اس کا کام کرنے کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا مگر دو سال کی سعیِ لاحاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور مزاج میں سکون آ چکا تھا۔ مگر اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے نے اس کے خیالوں میں ہلچل مچا دی۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آئند خیالات ہر روز اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے دفتر جاتے دفتر سے آتے، کوٹھیوں کے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ دیکھ کر یہاں تک کہ جب مہینہ ختم ہوا اور اُسے تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگ تراش کے پاس لے گیا جس نے بڑی چابک دستی سے اُس پر اِس کا نام کندہ کر کے کونوں پر چھوٹی چھوٹی خوش نما بیلیں بنا دیں۔

اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کُھدا ہوا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا ہو۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اُس کا جی چاہا کہ کتبے پر سے اخبار کو اُتار ڈالے جس میں سنگ تراش نے اس کو لپیٹ دیا تھا اور اُس پر ایک نظر اور ڈال لے۔ مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا، شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کے کتبے کو دیکھ کر اُس کے اُن خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے اس دماغ پر مسلط تھے۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اُس نے اخبار اُتار پھینکا اور نظریں کتبے کی دل کش تحریر پر گاڑے دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ جیب سے چابی نکالی، قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس مکان کے دروازے کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں کہ اِن پر کوئی بورڈ لگایا جا سکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی تو اس قسم کے کتبے وہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تو بڑا سا مکان چاہیے، جس

کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے۔

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا اور سوچنے لگا کہ فی الحال اس کتبے کو کہاں رکھوں۔ اس کے حصہ مکان میں دو کوٹھڑیاں، ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک کوٹھڑی میں تھی مگر اس کے کواڑ نہیں تھے۔ بالآخر اس نے کتبے کو اُسی بے کواڑ الماری میں رکھ دیا۔

ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبے پر پڑتی۔ اُمیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں اور دفتر کی مشقت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اُٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا آرزوئیں اس کے سینے میں ہیجان برپا کر دیتیں۔ افسر کی ایک نگاہ لطف و کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اس کے بیوی بچے نہیں آئے وہ اپنے خیالوں ہی میں مگن رہا۔ نہ دوستوں سے ملتا، نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا۔ رات کو جلد ہی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آجاتا اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا۔ مگر ان کے آنے کی دیر تھی کہ نہ وہ فراغت ہی رہی اور نہ وہ سکون ہی ملا۔ ایک بار پھر گرہستی کے فکروں نے ایسا گھیر لیا کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑ گئیں۔

کتبہ سال بھر تک اُسی بے کواڑ الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی مگر اُس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اس کے بیٹے کی عمر چار برس کی ہوگئی تھی اور اس کا ہاتھ اس بے کواڑ الماری تک بہ خوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا بیٹا کتبہ نہ گرا دے اسے وہاں سے اٹھا لیا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

ساری سردیاں یہ کتبہ اس کے صندوق ہی میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو اس کی بیوی کو گرم کپڑے رکھنے کے لیے اس کے صندوق میں سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چناں چہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبے کو بھی نکال کر کاٹھ کے اس پرانے بکس میں ڈال دیا جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے، بے بال کے برش، بے کار صابن دانیاں رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اب اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفہ غیبی سے نہیں ہوتی ہے۔ کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اُس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا ہے جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا اور اسے زیادہ تنگی نہ اُٹھانی پڑتی۔

پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اُس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل چکے تھے اور کتبے کی یاد تک اس کے ذہن سے محو ہو چکی تھی تو اس کے افسروں نے اس کی دیانت داری، پرانی

کارگزاری کا خیال کر کے اسے تین مہینے کے لیے عارضی طور پر درجہ اوّل کے ایک کلرک کی جگہ دے دی جو چھٹی جانا چاہتا تھا۔

جس روز اُسے یہ عہدہ ملا اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا۔

اگلے مہینے اس نے نیلام گھر سے ایک سستی سی لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اسے پھر کتبے کی یاد آئی اور اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر کاٹھ کی پیٹی سے کتبے کو نکالا صابن سے دھویا پونچھا اور دیوار کے سہارے میز پر لٹکا دیا۔

یہ زمانہ اس کے لیے بہت کٹھن تھا کیوں کہ وہ اپنے افسروں کو اپنی برتر کارگزاری دکھانے کے لیے چھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دوگنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لیے بہت سا اُن کا کام بھی کر دیتا۔ گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق رہتا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا اس کا دل بُجھ جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوالے۔

ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے...... ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے......

مگر جب تین مہینے گزرے تو نہ تو اُس کلرک نے چھٹی کی میعاد بڑھوائی اور نہ ہی بیمار پڑا۔ البتہ شریف حسین کو اپنی پرانی جگہ پر آجانا پڑا۔

اس کے بعد جو دن گزرے وہ اس کے لیے بڑی مایوسی اور افسردگی کے حامل تھے۔ تھوڑی سی خوش حالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اُسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ بدتر معلوم ہونے لگی۔ ہر وقت بیزار بیزار سا رہتا، نہ کبھی ہنستا، نہ کسی سے بولتا چالتا۔ مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور جلد ہی اُسے راہِ راست پر لے آئے۔

اب اس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چوتھی میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی، سینا پرونا، سیکھتی اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جمالیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ سکول کا کام کیا کرتا۔ چوں کہ میز کے ہلنے سے کتبے کے گر جانے کا خدشہ رہتا تھا اور پھر اس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی اس لیے لڑکے نے اسے اٹھا کر پھر اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ اس عرصہ میں کتبے نے کئی جگہیں بدلیں۔ کبھی بے کواڑ الماری میں، تو کبھی میز پر، کبھی صندوقوں کے اوپر، تو کبھی چارپائی کے نیچے، ایک دفعہ کسی نے اُٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دیا جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی، دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ اُٹھا کر دھویا، پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔ مگر چند ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا گیا اور اُس جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیے گئے جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیے تھے۔ رنگ

پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہوا بدنما معلوم ہوتا تھا مگر اب کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھڑی دہک اٹھی تھی۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے بیس برس گزر چکے تھے۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم آ گیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اس کے دماغ میں خوش حالی و فارغ البالی کے خیال چکر لگاتے مگر اب ان کی کیفیت پہلے کی سی نہ تھی کہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو تصورات کا ایک تسلسل ہے کہ پہروں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب اکثر اوقات آہ، دم بھر میں اُن تصورات کو اُڑا لے جاتی اور پھر بیٹی کی شادی، لڑکوں کی تعلیم، اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات، پھر ساتھ ہی ساتھ ان کے لیے نوکریوں کی تلاش، یہ ایسی فکریں نہ تھیں کہ پل بھر کو بھی اس کے خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں۔

پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ اب اس کا بڑا بیٹا ریل کے گودام میں کام کرتا تھا۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب ملا کر کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی تھی جس میں بہ خوبی گزر ہونے لگی تھی۔ علاوہ ازیں اس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا۔

اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بدولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں۔ ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی مگر پھر جلد ہی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں نے دبانا شروع کر دیا اور وہ زیادہ تر چارپائی ہی پر پڑا رہنے لگا۔

جب اُسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اُٹھا، گرم گرم لحاف سے نکلا تھا، پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کے بتیرے علاج معالجے کرائے۔ اس کی بیوی اور بہو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں مگر افاقہ نہ ہوا اور وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کرا رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں اسے وہ کتبہ مل گیا۔ بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی۔ کتبے پر باپ کا نام دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اس کی خطاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔ اچانک اُسے ایک بات سوجھی جس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

اگلے روز وہ کتبے کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا۔ اس نے کتبے کی عبارت میں تھوڑی سے ترمیم کرائی اور پھر اُسی شام اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

(جزیرۂ سخنوراں)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) کلرک غیر زبان میں گفتگو کرنے کی کوشش کیوں کرتے تھے؟

ب) کلرک نے کتبہ کتنے میں خریدا؟

ج) درجہ اوّل کی جگہ شریف حسین کو کیوں کر ملی؟

د) کلرک نے سنگ تراش سے کتبہ پر کیا لکھوایا؟

ہ) باپ کی موت کے بعد بیٹے نے کتبے کا کیا کیا؟

و) کلرک نے گھر جا کر کتبہ کہاں رکھا؟

۲۔ متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) کلرک کے بیٹے تھے:

i) ایک ii) دو

iii) تین iv) چار

ب) پیشے کے لحاظ سے شریف حسین تھا:

i) اُستاد ii) کلرک

iii) افسر iv) چپڑاسی

ج) کلرک نے دفتر سے شہر تک سفر کیا:

i) بس میں ii) ٹرین میں

iii) تانگے میں iv) رکشہ میں

د) کلرک رہتا تھا:

i) سرکاری مکان میں ii) ذاتی مکان میں

iii) کرایے کے مکان میں iv) ہوٹل میں

سبق ''کتبہ'' صنف ادب کے لحاظ سے ہے:

i) داستان　　ii) ناول

iii) ڈراما　　iv) افسانہ

۳۔ متن کے مطابق درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) کلرک دفتر سے کافی دیر بعد نکلا۔

ب) کلرک نے دفتر سے شہر تک رکشے میں سفر کیا۔

ج) شریف حسین سرکاری دفتر میں درجہ دوم کا کلرک تھا۔

د) کلرک پچپن برس کی عمر میں پنشن ہوا۔

ہ) کلرک نے تین ماہ تک عارضی طور پر درجہ اوّل کلرک کے طور پر کام کیا۔

و) کلرک کے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادی سادگی سے ہوئی۔

۴۔ متن کے مطابق درست الفاظ سے خالی جگہیں پُر کریں۔

الف) کلرک کا بڑا بیٹا ریل کے .... میں کام کرتا تھا۔

(گودام ۔ دفتر ۔ بکنگ آفس میں)

ب) کلرک نے .... سے کتبہ پر اپنا نام کندہ کرایا۔

(سنگ تراش ۔ پینٹر ۔ ڈیزائنر)

ج) کلرک نے کتبہ .... روپیہ میں خریدا۔

(ایک ۔ دو ۔ تین)

د) شریف حسین سرکاری دفتر میں .... کلرک تھا۔

(درجہ اوّل ۔ درجہ دوم ۔ درجہ سوم)

۵۔ سیاق وسباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل کی وضاحت کیجیے۔

الف) مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اُسے محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اُسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

ب) سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا......ان خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے دماغ پر مسلط تھے۔

ج) اس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا۔

د) تھوڑی سی خوش حالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اُسے اپنی حالت پہلے سے بھی بدتر معلوم ہونے لگی۔ ہر وقت بیزار بیزار سا رہتا۔ نہ کبھی ہنستا، نہ کسی سے بولتا چالتا۔ مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور جلد ہی اسے راہِ راست پر لے آئے۔

ہ) افسر کی ایک نگاہِ کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

٦۔ چند کلرک ہر روز فائلیں ساتھ گھر کیوں لے جاتے تھے اور اس کا نتیجہ کیا ہوتا تھا؟

٧۔ مصنف نے مختلف کلرکوں کی جو وضع قطع بیان کی ہے۔ اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

٨۔ اس سبق کا خلاصہ تحریر کریں۔

عبارت میں معاون یا امدادی افعال کا استعمال

معاون یا امدادی افعال وہ افعال ہیں۔ جو دو جملوں سے مرکب ہوتے ہیں۔ دو فعل مل کر ایک مرکب فعل کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ وہ افعال جو دوسرے افعال کے معاون ہوتے ہیں۔ اور اُن کے ملنے سے کلام میں خوبی، لطافت اور زورِ حسن پیدا ہوتا ہے۔ بعض اوقات اصل فعل کو اپنا مطلب واضح کرنے کے لیے امدادی یا معاون فعل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے افعال کو معاون یا امدادی افعال کہتے ہیں۔ مثلاً ہم کرکٹ کھیل چکے ہیں۔ اُس نے خط لکھ دیا ہے وغیرہ۔

سرگرمیاں

١۔ اساتذہ کرام طلبہ سے عبارت میں معاون فعل تلاش کروائیں۔
٢۔ کسی بھی ادب بارے میں صنائع لفظی و معنوی کی پہچان کروائیں۔
٣۔ غلام عباس کے دو اور افسانے کمرہ جماعت میں سنوائے جائیں۔

اشاراتِ سبق

١۔ اساتذہ کرام طلبہ کو اُردو ادب میں افسانے کے خدوخال سے آگاہ کریں۔
٢۔ اُردو میں افسانے کے تدریجی ارتقا پر لیکچر دیں۔
٣۔ غلام عباس کا طرزِ تحریر بتائیں۔
٤۔ اُردو افسانوی ادب میں غلام عباس کا مقام بتائیں۔